23

احمدی طالب علموں سے خطاب

(فرمودہ 25 جولائی 1941ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

"ایک ہفتہ تک قادیان کے سکولوں اور کالجوں میں چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ کل اسی تقریب پر مَیں تحریک جدید کے بورڈنگ ہاؤس میں گیا تھا مگر تحریک جدید کے طالب علم اس تعداد کے مقابلہ میں جو قادیان کے مدارس میں تعلیم پاتے ہیں بہت کم ہیں اس لئے وہاں میں طالب علموں اور استادوں کے ایک حصہ کو ہی مخاطب کر سکا تھا۔

اس وقت قادیان کی مختلف درسگاہوں میں قریباً ڈیڑھ ہزار لڑکے یا اس سے کچھ زیادہ تعلیم پاتے ہیں۔ اسی طرح پانچ چھ سو یا اس سے کچھ زیادہ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ گویا قریباً دو ہزار طالب علم پڑھتے ہیں۔ چھٹیاں طالب علموں کے لئے کچھ ایسی خوشکن ہوتی ہیں کہ آپ ہی آپ دل میں مسرت کے جذبات کھیلنے لگتے ہیں۔ یہاں کثیر حصہ ایسے طالب علموں کا ہے جن کے ماں باپ دوسرے علاقوں کے رہنے والے ہیں۔ ماں باپ کی محبت اور ان سے ملنے کی خواہش کی وجہ سے ان کو چُھٹیوں کا انتظار رہتا ہے اور جب چھٹیاں آتی ہیں تو ان کے دل خوشی سے بھر جاتے ہیں۔ ایک اور حصہ طالب علموں کا وہ ہے جن کے ماں باپ قادیان میں ہی رہتے ہیں مگر ان کے دل بھی چھٹیوں کی وجہ سے خوشی سے کچھ کم نہیں بھرتے۔ وہ بھی اپنے دلوں میں ایسی ہی خوشی محسوس کرتے ہیں جتنی وہ جنہوں نے ماں باپ کی ملاقات کے لئے

واپس جانا ہوتا ہے۔ ایسے طالب علموں میں سے کچھ تو اس لئے خوش ہوتے ہیں کہ پڑھائی سے فراغت ہو جائے گی اور خوب کھیلیں گے اور کچھ اس لئے خوش ہوتے ہیں کہ جب دوسرے بچے باہر جائیں گے تو ہمارے ماں باپ بھی ہمیں کہیں باہر بھیج دیں گے چونکہ چھٹیوں کے موقع پر طالب علموں کے لئے ریلوے کنسیشن وغیرہ ملتے ہیں اس لئے ایسے بچوں کو بھی ان کے ماں باپ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے پاس کہیں باہر بھیج دیتے ہیں تا چھٹیوں میں سیر کر آئیں۔ پھر کچھ طالب علم ایسے ہوتے ہیں جنہوں نے نہ تو پڑھائی سے غافل ہونا ہوتا ہے اور نہ انہیں باہر جانے کی کوئی امید ہوتی ہے۔ مگر وہ چُھٹی کے لفظ سے ہی خوش ہوتے ہیں جیسے عید کے دن سینکڑوں وہ لوگ بھی خوش ہوتے ہیں جن کے لئے بظاہر خوشی کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ وہ غریب ہوتے ہیں اس لئے نہ تو ان کے ہاں کوئی اچھا کھانا پک سکتا ہے اور نہ انہیں نئے کپڑے مل سکتے ہیں۔ وہ اسی لئے خوش ہوتے ہیں کہ ان کے ہمسائے خوش نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کئی طالب علم اس لئے خوش ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھی خوش ہیں۔ بہرحال یہ طالب علموں کے لئے خوشی کے ایام ہوتے ہیں۔

اگر وہ غور کریں تو انہیں معلوم ہو کہ خوشی کیا چیز ہے۔ حقیقی خوشی ہی کامیابی کا موجب ہو سکتی ہے۔ مصنوعی خوشیاں بسا اوقات دوسرے کے دل میں رقت پیدا کر دیتی ہیں۔ کہتے ہیں کسی بیوہ عورت کا ایک ہی بچہ تھا جو دودھ پیتا تھا۔ مگر ایسی عمر کو پہنچ چکا تھا جب بچہ کچھ کچھ بولنے لگتا اور حرکت کرنے اور چلنے پھرنے لگتا ہے اور اس کا دودھ چھڑانے لگتے ہیں۔ اس کی ماں بیمار تھی اور رات کو مر گئی۔ جب صبح دروازہ نہ کھلا تو ہمسائے آئے اور جب دروازہ کھلا تو دیکھا کہ ماں مری پڑی ہے اور بچہ کبھی اس کے پستان مُنہ میں ڈالتا ہے۔ کبھی اس کے ماتھے پر پیار سے تھپڑ مارتا ہے اور جب وہ اس پر بھی نہیں بولتی تو کھکھلا کر ہنسنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ میری ماں میرے ساتھ مذاق کرتی ہے۔ اس لئے نہیں بولتی اور میرے ہنسنے سے وہ بھی ہنس پڑے گی۔ لوگ اگر صرف اس کی ماں کو مُردہ دیکھتے تو شاید ان کو اتنا رونا

نہ آتا جتنا کہ اس حالت میں اس کے بچہ کو ہنستا دیکھ کر انہیں آیا ہو گا۔

تو کئی خوشیاں ایسی ہوتی ہیں جو دراصل رونے کا موجب ہوتی ہیں۔ وہ جہالت، نادانی اور ناواقفی کی خوشیاں ہوتی ہیں۔ ان میں حصہ لینے والا جانتا نہیں کہ دنیا مجھ پر رو رہی ہے اور مَیں مصیبتوں میں مبتلا ہوں۔ آج مسلمانوں کی خوشیاں دیکھ لو۔کیا آج مسلمان خوش نہیں ہوتے، کیا آج مسلمان قہقہے نہیں لگاتے۔وہ خوش بھی ہوتے ہیں، قہقہے بھی لگاتے ہیں اور ہر وہ کام جو کامیاب قوموں کو زیب دیتا ہے کرتے ہیں۔وہ میلوں اور تماشوں میں بھی جاتے ہیں۔ان سب جلسوں وغیرہ میں جو خوشیوں کے اظہار کے لئے ہوتے ہیں شامل ہوتے ہیں۔وہ شعر و شاعری کا مذاق بھی رکھتے ہیں۔شعر کہتے اور ایک دوسرے کے شعر سن کر سر دھنتے اور داد دیتے ہیں۔خوب قہقہے لگاتے ہیں بلکہ ہندوؤں ، سکھوں اور عیسائیوں سے زیادہ ہنستے ہیں اورہنستے ہوئے ان کی باچھیں، ان قوموں کے لوگوں کی نسبت زیادہ کھلتی ہیں جو حکمران ہیں۔مگر کیا مسلمانوں کی یہ ہنسی، یہ قہقہے اور یہ مسکراہٹیں حقیقی خوشی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔کہاں وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کا سر دین اور دنیا دونوں لحاظ سے سب سے اونچا تھا۔ایک مسلمان کے قول کو سب سے زیادہ معتبر سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے بادشاہوں کی بات پر اتنا اعتبار نہ کیا جاتا تھا جتنا ایک عامی مسلمان کی بات پر۔ مسلمان اگر کوئی بات کہہ دیتا تو لوگ سمجھتے تھے یہ ضرور ہو کر رہے گی۔ایک مرتبہ اسلامی لشکر شام میں آرمینیا کے کنارے پر عیسائیوں سے سخت جنگ لڑ رہا تھا۔بڑی لمبی جنگ کے بعد مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا کہ کل ہم فتح حاصل کر لیں گے عیسائیوں کو بھی جو محصور تھے یہ سمجھ آگئی کہ اب وہ مقابلہ نہیں کر سکتے۔ان کی مقابلہ ومقاومت کی آخری کوشش بھی ناکام ہو چکی ہے اور اب مسلمانوں کی فتح کے راستہ میں کوئی روک نہیں اور وہ کل تک ضرور فتح پا لیں گے۔ایک مسلمان حبشی غلام چشمہ سے پانی بھر رہا تھا۔عیسائیوں کا ایک افسر اس کے پاس آیا اور کہا کہ لو میاں اگر ہم قلعہ چھوڑ دیں تو بتاؤ کن شرطوں پر صلح کر لو گے۔اگر تم یہ یہ باتیں مان لو تو ہم ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

بتاؤ کیا یہ شرائط منظور ہیں۔ وہ بے چارہ اَن پڑھ آدمی تھا۔ اس نے سمجھا یہ باتیں منظور ہی ہوں گی۔ جب لڑائی ختم ہو رہی ہے تو ان کے ماننے میں کیا حرج ہے اور اس لئے اس نے کہہ دیا کہ ہاں منظور ہیں۔ اس پر عیسائیوں نے اعلان کر دیا کہ مسلمانوں کے ساتھ صلح ہو گئی ہے اور دروازے کھول دیئے۔ جب اسلامی جرنیل پہنچے تو انہوں نے کہا کہ ہم نے تو کوئی صلح کی نہیں۔ تم لوگوں نے کس کے ساتھ صلح کی ہے۔ عیسائیوں نے کہا کہ فلاں حبشی نے ہم سے یہ معاہدہ کیا ہے۔ مسلمانوں افسروں نے کہا کہ وہ کوئی افسر نہ تھا اور اسے صلح کی شرائط طے کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ عیسائیوں نے جواب دیا کہ ہمیں کیا علم تمہارا کون افسر ہے اور کون نہیں۔ ہم سے معاہدہ ہو چکا ہے۔ اور اب تم لوگوں کو اس کی پابندی کرنی چاہئے۔ اسلامی سپہ سالار نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سارے واقعہ کی اطلاع دے دی اور لکھا کہ یہ عجیب واقعہ ہوا ہے۔ عیسائیوں نے ہمارے ساتھ چالاکی کی ہے اور ایک حبشی سے بات چیت کر کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اب ہم حیران ہیں نہ ان کی شرطوں کو مان سکتے ہیں اور نہ لڑائی کر سکتے ہیں۔ شرطیں ایسی ہیں جو ہمارے لئے قابل تسلیم نہیں۔ سارا معاملہ آپ کے پیش کیا جاتا ہے۔ آپ اجازت دیں کہ ہم اس ملک پر اسی طرح قبضہ کریں جس طرح ایک فاتح قبضہ کرتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ آپ نے جو کچھ لکھا درست ہے بے شک مسلمانوں نے سخت جنگ کی اور اس ملک کو فتح کیا اور بے شک عیسائیوں نے دھوکا کیا ہے۔ مگر مَیں تمہاری رائے کو تسلیم کر کے اسی طرح ملک پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دوں جس طرح فاتح قبضہ کرتا ہے تو لوگ کہیں گے کہ مسلمانوں کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ حبشی بہرحال مسلمان ہے اور مَیں اس کی بات کو جھوٹا نہیں کر سکتا۔ اس کے منظور کردہ شرائط کے مطابق ہی عیسائیوں سے صلح کی جائے۔[1] اگر حضرت عمر چاہتے تو اس معاہدہ کو رد کر سکتے تھے اور اس صورت میں دنیا کی کوئی قوم آپ پر اعتراض نہ کر سکتی تھی کیونکہ عیسائیوں نے جو کچھ کیا وہ سراسر دھوکا تھا۔ مگر پھر بھی آپ نے

اسے قبول کر لیا اور فرمایا مَیں نہیں چاہتا کہ لوگ کہیں کہ مسلمان کی بات جھوٹی ہو گئی اور یہ کہ مسلمانوں میں ایک حبشی کی بات قابل اعتبار نہیں اور عرب کی ہے۔ کوئی فلسفی کہہ سکتا ہے کہ پھر ایسی مثالیں تو روز پیش آ سکتی ہیں اور حکومت کی تباہی کا موجب ہو سکتی ہیں مگر یہ درست نہیں۔ اس قسم کی بات ایک ہی دفعہ ہو سکتی ہے۔ اسے اصول کے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

رسول کریم ﷺ ایک مرتبہ مجلس میں تشریف فرما تھے اور جنت کی نعماء کا ذکر فرما رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ وہاں اس طرح روحانی ترقیات عطا ہوں گی یوں علوم کی ترقی ہو گی یوں فرشتے نازل ہوں گے اور یہ کہ فلاں فلاں انعامات اللہ تعالیٰ نے میرے لئے مقدر فرمائے ہیں۔ معاً ایک صحابی کھڑے ہوئے اور یَا رَسُوْلَ اللّٰہ کہا! دعا کریں کہ جنت میں اللہ تعالیٰ مجھے بھی آپ کے ساتھ رکھے۔ آپ نے دعا کی اور فرمایا اللہ تعالیٰ تمہیں بھی ساتھ رکھے گا۔2 اب خدا جانے اس صحابی کا درجہ کیا تھا۔ اس کے اعمال رسول کریم ﷺ کے اعمال کا لاکھواں کروڑواں حصہ بھی نہ ہوں گے۔ وہ نہ کبھی ایسے اعمال بجا لایا جو رسول کریم ﷺ بجا لاتے اور نہ وہ عبادتیں کیں جو آپ کرتے تھے۔ صرف ایک فقرہ کہا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی خواہش کو قبول فرما لیا۔ اب کوئی معترض کہہ سکتا ہے کہ یہ تو بڑا آسان کام ہے جو اٹھا اس نے یہ فقرہ کہہ دیا۔ مگر یہ بات نہیں۔ جب رسول کریم ﷺ نے اس صحابی کی بات کو سن کر دعا کی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی خواہش کو قبول فرما لیا ہے تو ایک اور صحابی اٹھے اور کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ! مَیں بھی چاہتا ہوں کہ جنت میں آپ کا ساتھ حاصل ہو۔ مگر آپ نے فرمایا کہ نہیں وہ پہلی بات تھی جو پوری ہو گئی۔ اب اس کی نقل میں بات کرنے والوں کو یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ غرض ایسے امور میں جو فیصلہ ہو وہ بطور سبق کے ہوتا ہے نہ کہ بطور دوامی دستور کے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حبشی مسلمان کی بات صرف اس لئے مان لی کہ اس سے پہلے کوئی اصل قائم نہ ہوا تھا اور آپ ڈرے کہ ایک مسلمان کا قول بے وقعت نہ ہو۔

مگر اس کے یہ معنی نہ تھے کہ آئندہ بھی ایسا فیصلہ تسلیم کیا جایا کرے۔ بہرحال حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مسلمان کی بات کی اتنی قیمت قرار دے دی جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ کجاتو وہ زمانہ تھا اور کجا آج یہ زمانہ ہے کہ مسلمان کی بات ماننے کو کوئی تیار نہیں ہوتا۔ مسلمان کوئی بات کہے تو لوگ کہتے ہیں یہ مسلمان نے کہی ہے معلوم نہیں پوری ہو یا نہ ہو۔ مَیں ایک دفعہ کشمیر گیا۔ حضرت خلیفہ اول کا زمانہ تھا۔ کشمیر میں لوئیوں کے ٹکڑے رنگ رنگ کر فرش پر بچھانے کے لئے ایک کپڑا بناتے ہیں۔ جسے گبّا کہتے ہیں۔ اسلام آباد میں ایک مشہور گبّا ساز تھا۔ ہم نے بھی اسے ایک گبّا بنانے کا آرڈر دیا اور سائز وغیرہ اچھی طرح بتا دیا۔ جب ہم سیر کرتے کراتے واپس اس شہر میں آئے تو پتہ کیا کہ گبّا تیار ہوًا ہے یا نہیں۔ اس نے کہا تیار ہے مگر جب اسے دیکھا تو سائز میں 25 فیصدی کا فرق تھا۔ مگر وہ کہے کہ سائز وہی ہے جو آپ نے بتایا تھا۔ غالباً اس کے ساتھ تحریر بھی ہو چکی تھی جس میں سائز درج تھا مگر وہ پھر بھی یہی کہتا جاتا تھا کہ یہ آپ کے بتائے ہوئے سائز کے مطابق تیار ہوًا ہے۔ محلہ کے لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے اور سب نے کہا کہ سائز وہ نہیں جو انہوں نے بتایا تھا۔ مگر ان سب باتوں کے جواب میں اس کا ایک ہی جواب تھا کہ مَیں مسلمان ہُندی۔ کشمیری مرد کو مؤنث کے طور پر بولتے ہیں۔ وہ مذکر کو مؤنث اور مؤنث کو مذکر بولتے ہیں۔ مثلاً کہیں گے چور آئی۔ مَیں آئی، میری بیوی آیا۔ تو وہ صرف یہی جواب دیتا تھا کہ مَیں مسلمان ہُندی یعنی مَیں مسلمان ہوں مجھے اس کی یہ بات سن کر بہت غصہ آیا اور میں نے کہا کہ تم یہ کیوں کہتے ہو مَیں مسلمان ہوں اس لئے یہ بد دیانتی میرے لئے جائز ہے۔ تم صاف کہو مجھ سے غلطی ہوئی ہے یا میں نے دھوکا کیا ہے۔ تم اپنے فعل کو مسلمان ہونے کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو۔ تو آج یہ حالت ہے کہ نہ مسلمانوں کے کسی معاہدہ کا اعتبار ہے اور نہ ان کے کسی معاملہ کا۔ لین دین ان کا خراب ہو چکا ہے۔ کسی سے قرض لیں گے تو واپس نہ کریں گے، مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ ان کا سلوک ہمدردانہ نہیں، ہمسائیوں سے

سلوک اچھا نہیں، جوش میں آ جائیں تو بے شک قربانی کریں گے مگر یہ صرف ایک دو دن یا ایک دو گھنٹہ تک ہی ہو گی اس سے زیادہ نہیں۔ آج سے تھوڑا ہی عرصہ ہوا شہید گنج کے گوردوارہ کے متعلق ان میں کتنا جوش پایا جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر ہی دم لیں گے اور جب تک اس جگہ پر قبضہ نہ کر لیں گے چین سے نہ بیٹھیں گے مگر آج وہی شہید گنج موجود ہے وہی سکھوں کا اس پر قبضہ ہے اور حرام ہے کہ مسلمانوں میں اتنی بھی حرکت ہوتی ہو جتنی چیونٹی کے چلنے سے ہوتی ہے۔ بس بات ختم ہو گئی۔

تو آج دیکھو مسلمانوں کی حالت کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔ وہ زمانہ جو اسلامی تاریخ کا گرا ہوا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ آج مسلمانوں میں اُس زمانہ کے مسلمانوں جیسے اخلاق بھی نہیں ہیں۔

خلافتِ عباسیہ کا آخری زمانہ بڑا دردناک اور بہت تنزل کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت خلفائے عباسیہ کی حیثیت قیدیوں کی سی تھی۔ کبھی ترک، کبھی سلجوقی اور کبھی کُرد اصل حاکم ہوتے تھے۔ جس طرح ایک زمانہ میں دہلی کے بادشاہ انگریزوں کے ماتحت ہوتے تھے۔ یہ ترک، سلجوقی، یا کُرد حاکم جو چاہتے حکم دے دیتے اور کہہ دیتے کہ خلیفہ نے یوں فرمایا ہے جس طرح دہلی کے بادشاہوں کو وظائف ملتے تھے اسی طرح خلفائے عباسیہ کو بغداد میں وظائف ملتے تھے مگر اس زمانہ میں بھی اسلامی غیرت باقی تھی کیونکہ محمد مصطفی ﷺ کا جو تمام خوبیوں اور محاسن کے منبع ہیں زمانہ قریب تھا۔ اس زمانہ میں عیسائیوں نے شام پر حملہ کر کے کچھ علاقہ فتح کر لیا۔ عکہ اور اس کے گرد ونواح پر قابض ہو گئے۔ اس علاقہ میں مسلمان بھی آباد تھے۔ بلکہ سارا علاقہ مسلمان ہو چکا تھا سوائے ان برطانوی، اطالوی، جرمن اور آسٹرین فوجوں کے جو وہاں تھیں۔ انہوں نے پاس کے اسلامی علاقہ پر حملہ کیا۔ وہاں کوئی مسلمان عورت تھی۔ کسی عیسائی سے اس کا جھگڑا ہوا اور عیسائی نے اس کی بے حرمتی کی اور اس کا برقعہ، یا نقاب اتارا گیا اور مارا گیا۔ جب اس کی ہتک کی گئی تو

اس عورت نے جو بالکل ناواقف تھی اور جسے کچھ پتہ نہ تھا کہ خلیفہ عباسی کونسا ہے اور کس حالت میں ہے۔ اس نے اپنے کسی رشتہ دار سے اتنا سنا ہوا ہو گا کہ مسلمانوں کا کوئی خلیفہ ہے جو بغداد میں رہتا ہے۔ یہ کہ اس کی حالت کیا ہے، وہ محض ایک قیدی ہے اور اس کی کوئی طاقت نہیں۔ یہ اسے علم نہ تھا، مارپیٹ کے وقت وہ چلّائی۔ مسلمانوں میں رواج تھا کہ جب نعرہ لگاتے تو یَا لَلْمُسْلِمِیْنَ کہتے۔ یعنی اے مسلمانو! ہم تمہیں پکارتے ہیں۔ اسی طرح اس عورت نے کہا کہ اے مسلمانو! اے بغداد کے خلیفہ! مَیں تم کو پکارتی ہوں۔ جب اس نے یہ نعرہ لگایا۔ مسلمان تاجروں کا کوئی قافلہ اپنے رستہ پر گزر رہا تھا۔ اسے یہ آواز عجیب معلوم ہوئی کہ کہاں بغداد کا خلیفہ جو بالکل کمزور ایک قیدی کی طرح ہے اور کہاں شام کا یہ علاقہ۔ خلیفہ یہاں اس عورت کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ مگر اہلِ قافلہ کے دل پر ایک چوٹ لگی۔ قافلہ جب بغداد میں پہنچا تو بازار میں اپنا اسباب وغیرہ اتارنے لگا۔ اس زمانہ میں تجارت چونکہ قافلوں کے ذریعہ ہی ہوتی تھی۔ جب کوئی قافلہ سامانِ تجارت لے کر آتا تو سب امیر و غریب تجارتی چیزوں کو دیکھنے کے لئے بازار میں جمع ہو جاتے تھے۔ وہیں چیزیں دیکھتے اور قافلہ والوں سے سفر کے حالات سنتے تھے۔ قافلہ والوں میں سے کسی نے یہ بات بھی بیان کی کہ اس طرح شام میں ہم نے ایک مسلمان عورت کی آواز سنی جسے کسی عیسائی نے مارا اور اس کی بے حرمتی کی تھی۔ اس نے خلیفہ کو پکارا اور کہا مَیں تجھے مدد کے لئے پکارتی ہوں۔ جس طرح دہلی کے بادشاہوں کے دربار لگتے تھے باوجودیکہ وہ برائے نام بادشاہ ہوتے تھے اسی طرح عباسی خلفاء بھی دربار میں بیٹھتے تھے۔ اس زمانہ میں جو خلیفہ تھا وہ اپنے دربار میں بیٹھا تھا کہ کسی درباری نے بازار سے یہ بات سن کر اس کے سامنے بھی بیان کر دی۔ اور کہا کہ حضور! یہ عجیب بات اہلِ قافلہ سے معلوم ہوئی ہے۔ عیسائیوں نے آگے بڑھ کر چھاپہ مارا، کسی عیسائی نے ایک مسلمان عورت کی بے حرمتی کی اور اس عورت نے اس طرح دُہائی دی باوجودیکہ اس وقت اس خلیفہ کی حالت شطرنج کے بادشاہ کی تھی۔ اس نے یہ بات سنی تو یہ

اسے کھا گئی۔ وہ فوراً تخت سے نیچے اتر کر ننگے پاؤں چل پڑا اور کہا کہ مَیں اب واپس نہیں لوٹوں گا جب تک کہ اس مسلمان عورت کا بدلہ نہ لے لوں۔ اس نے شہر سے باہر آ کر خیمے لگا دیئے۔ شہر میں اور علاقہ میں آگ کی طرح یہ بات پھیل گئی اور مسلمان نوجوان اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ آخر یہ لشکر شام کی طرف چلا۔ عیسائیوں پر حملہ کیا اور عیسائیوں نے مسلمانوں سے جو علاقے نئے لئے تھے وہ ان سے واپس لئے اور اس طرح اس عورت کی داد رسی کر کے خلیفہ عباسی واپس آیا۔

یہی دردِ اسلامی تھا جس نے سینکڑوں سال اسلام کے نام کو اونچا کئے رکھا۔ یہ گرے ہوئے زمانہ کا حال ہے جب عیسائیت پھر سر نکال رہی تھی جب اسلامی نظام ٹوٹ چکا تھا بلکہ پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ مگر آج کیا ہے؟ نہ بادشاہوں کے دل میں یہ اسلامی درد پایا جاتا ہے اور نہ رعایا کے دل میں۔ ایک اسلامی حکومت بھی تو ایسی نہیں جس نے کبھی اسلامی جذبہ کے ماتحت کسی دوسری اسلامی حکومت کا ساتھ دیا ہو۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ ترکوں پر کسی دشمن نے چڑھائی کی تو ایران اور افغانستان نے اس کا ساتھ دیا ہو یا ایران پر حملہ ہوا اور افغانستان اور ترکوں نے اس کی مدد کی ہو۔ یورپ کی عیسائی حکومتوں میں یہ بات نظر آتی ہے مگر اسلامی حکومتوں میں نہیں۔ پولینڈ پر حملہ ہوا تو برطانیہ اور فرانس اس کی طرف سے لڑے۔ چیکوسلواکیہ پر حملہ ہونے لگا تھا تو برطانیہ، فرانس اور روس اس کی طرف سے لڑنے کو تیار ہو گئے تھے۔ جرمنی پر حملہ ہوا تو اٹلی اس کی طرف سے لڑنے کو تیار ہو گیا۔ تو دوسری قوموں میں تو یہ بات ہے مگر مسلمانوں میں نظر نہیں آتی۔ انہوں نے کبھی بھی وہ ہمدردی نہیں دکھائی جو مسلمانوں کے لئے ایک دوسرے سے رکھنی ضروری ہے حالانکہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسلمان آپس میں ایک جسم کی طرح ہیں۔ جب ایک عضو میں تکلیف ہو تو سارا جسم درد محسوس کرنے لگتا ہے۔3 ہاتھ کی انگلی میں درد ہو، مُنہ کے کسی حصہ میں تکلیف ہو یا پنڈلی پر بِھڑ کاٹ جائے تو کیا باقی جسم

درد محسوس نہیں کرتا۔ دیکھو آدمی کو نزلہ تو ہوتا ہے ناک میں مگر کس طرح سارا جسم بے چین ہو جاتا ہے۔ کھانسی سینہ میں ہوتی ہے مگر کیا لاتوں اور پیروں کو اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ جسم کے کسی حصہ پر پھوڑا ہو تو کیا باقی جسم آرام میں ہوتا ہے۔ اگر مسلمان اس چیز کو پیش نظر رکھتے اور رسول کریم ﷺ نے جو مثال دی تھی اسے صحیح تسلیم کرتے اور جس طرح جسم کے کسی حصہ پر پھوڑا نکلنے سے تمام جسم بے چین ہوتا ہے یا نزلہ ہونے کی حالت میں سارا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے۔ مسلمان سارے عالم اسلامی کی تکلیف کو اپنی تکلیف محسوس کرتے تو مسلمانوں کو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا مگر مَیں کہتا ہوں۔ چھوڑ دو پرانے قصوں کو، چھوڑ دو ان لوگوں کو جنہوں نے مرکز اسلام سے مُنہ موڑ لیا اور رسول کریم ﷺ کی محبت دل سے نکال دی۔ تم جو آنحضرت ﷺ سے نیا تعلق پیدا کر رہے ہو جو خدا تعالیٰ سے نیا رشتہ جوڑ رہے ہو تم سوچو کہ کیا تمہارے دلوں کی یہی کیفیت ہے جو رسول کریم ﷺ نے فرمائی تھی۔ تم میں سے کتنے ہیں جن کے دل اپنے بھائی کی تکلیف پر اسی طرح دکھ محسوس کرتے ہیں جس طرح جسم کے ایک حصہ پر پھوڑا ہونے سے تمام جسم محسوس کرتا ہے۔

آج میں ساری جماعت کو مخاطب نہیں کرتا بلکہ صرف طالب علموں کو مخاطب کرتا ہوں جو چُھٹیاں منانے والے ہیں اور ان سے کہتا ہوں کہ تم قوم کی آئندہ اساس بننے والے ہو۔ تم وہ بنیادی پتھر ہو جس پر قوم کی نئی عمارت بننے والی ہے۔ ہمارے مکانات کتنے وسیع ہیں مگر باوجود اس کے کہ کئی بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں اوروہ علیحدہ مکانوں میں چلے گئے ہیں اور اپنے گھر بنا لئے ہیں پھر بھی بعض اوقات صحن میں سب کے سونے کے لئے جگہ نہیں ہوتی۔ اور یہ بچے جو اَب چھوٹے ہیں جب ان کی شادیاں ہو جائیں گی تو پھر تو شاید بیٹھنے کی بھی جگہ نہ ہو گی۔ یہی حالت قوموں کی ہوتی ہے۔ آنے والی نسلیں اپنے لئے اور گھر بناتی ہیں۔ وہ پہلوں کے ایمان پر ہی اکتفا نہیں کرتیں بلکہ ایمان کی نئی عمارت تعمیر کرتی ہیں۔ اگر تو ان کے

ایمان کی عمارت پہلوں سے اچھی ہو تو قوم کی عزت بڑھتی ہے، نہیں تو کم ہو جاتی ہے۔ کل بورڈنگ تحریک جدید میں مَیں نے جو تقریر کی اس میں بتایا تھا کہ ہم سات طالب علم تھے جنہوں نے مل کر رسالہ تشحیذ الاذہان جاری کیا۔ کسی سے کوئی مدد ہم نے نہیں لی۔ ایک پیسہ بھی چندہ کسی سے نہیں مانگا۔ اپنے پاس ہی سے سب رقوم دیں۔ ہاں بعد میں اگر بعض دوستوں نے اپنے طور پر کوئی مدد دی تو وہ لے لی۔ ورنہ سب بوجھ خود ہی اٹھایا۔ کسی سے مضمون بھی نہیں مانگا۔ خود ہی رسالہ کو ایڈٹ کرتے خود ہی چھاپتے اور خود ہی بھیجتے تھے۔ سب کام خود کرتے تھے اور اگر اس زمانہ میں وہ سات طالب مل کر یہ کام کر سکتے تھے تو اب ہمارے سکولوں کے 1500 لڑکے مل کر ان سے دو اڑھائی سو گنا زیادہ کیوں نہیں کر سکتے۔ یقیناً کر سکتے ہیں بشرطیکہ ان کے دلوں میں وہی جوش ہو بلکہ ان میں پہلوں سے زیادہ جوش ہونا چاہئے کیونکہ جسے بنا بنایا کام مل جائے اسے اس کو آگے چلانے میں بہت سی سہولتیں اور آسانیاں ہوتی ہیں۔

پس مَیں آج طالب علموں اور استادوں سے بھی کہ ان کی ذمہ داریاں بھی بہت زیادہ ہیں کہتا ہوں کہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے، سلسلہ کی طرف سے، صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے اور خلیفۂ وقت کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔ اب جو تم چھٹیوں پر جاؤ تو وہ ایمان اورجوش لے کر جاؤ کہ جہاں بھی تم جاؤ، جب وہاں سے واپس آؤ تو وہاں کی جماعت میں ایک بیداری پیدا ہو چکی ہو۔ تمہارے اس جانے اور آنے کی مثال چھوٹی سی پیدائش اور انتقال کی ہو۔ انتقال کے معنی مرنا ہی نہیں ہوتے بلکہ جگہ بدلنے کے بھی ہوتے ہیں اور جب کوئی کسی نئی جگہ جاتا ہے تو گویا اس کی نئی ولادت ہوتی ہے۔ مثلاً جب کوئی طالب علم چھٹیوں پر یہاں سے لاہور پہنچے گا تو ان چند ہفتوں کے لئے لاہور میں وہ گویا نیا جنم لے گا اور جب وہاں سے واپس آئے گا تو گویا وہاں سے انتقال کرے گا۔ دنیا کی ولادت بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ایک روح کو دنیا میں منتقل کر دیتا ہے تو یہ اس کی

پیدائش ہوتی ہے اور پھر جب وہ روح اگلے جہان کو جاتی ہے تو اس جہان سے اس کا انتقال ہوتا ہے اور ایک بڑی پیدائش بھی ہوتی ہے۔ایک عرب شاعر نے کہا ہے کہ ؎

يَا ذَا الَّذِىْ وَلَدَتْكَ اُمُّكَ بَاكِيًا وَ النَّاسُ حَوْلَكَ يَضْحَكُوْنَ سُرُوْرًا

فَاحْرِصْ عَلٰى عَمَلٍ تَكُوْنَ اِذَا فِىْ وَقْتِ مَوْتِكَ ضَاحِكًا بَكَوْا مَسْرُوْرًا[4]

یعنی اے انسان تُو وہی تو ہے کہ جب تو پیدا ہوُا تو تُو روتا تھا۔پیدائش کے وقت چونکہ بچہ کے سینہ پر دباؤ پڑتا ہے اور وہ روتا ہے اور یہ امر اس کے سانس کے چلنے کا موجب ہو جاتا ہے اورجو بچہ پیدائش کے وقت نہ روئے۔اس پر پانی کے چھینٹے دینے پڑتے ہیں تاکہ وہ ہچکی لے اور سانس چلنے لگے۔شاعر کہتا ہے کہ جب تُو پیدا ہوُا تو رو رہا تھا اورلوگ تیرے اردگرد خوشی سے ہنس رہے تھے۔بچہ کی پیدائش کے وقت لوگ خوشی کرتے ہی ہیں۔مبارک بادیں دیتے ہیں کہ لڑکا ہو گیا۔اسی کی طرف اشارہ کر کے شاعر انسان کی غیرت کو اکساتا ہے کہ جب تُو روتا تھا تو یہ لوگ تیرے اردگرد ہنس رہے تھے۔پس تجھے چاہئے کہ ان سے اس کا بدلہ لے۔وہ کس طرح؟ اس کا جواب وہ یوں دیتا ہے کہ ؎

فَاحْرِصْ عَلٰى عَمَلٍ تَكُوْنَ اِذَا فِىْ وَقْتِ مَوْتِكَ ضَاحِكًا بَكَوْا مَسْرُوْرًا

اب تُو ایسے عمل کر اور اس کا بدلہ اس طرح لے کہ جب تیری موت کا وقت آئے تو تیرے اردگرد سب لوگ رو رہے ہوں کہ ہمارا محسن اور ہمدرد دنیا سے چلا جا رہا ہے۔اب ہمارے کام کون کرے گا اور تُو ہنس رہا ہو کہ مَیں اپنے رب کے پاس چلاہوں۔جہاں مجھے بڑے بڑے انعام ملیں گے۔

تو میں طالب علموں اور استادوں سے کہتا ہوں کہ یہی نمونہ دکھاؤ۔یعنی جب

تم کسی جگہ جاؤ تو لوگ تمہارے آنے پر ہنسیں مگر جب واپس آؤ تو تمہارے ہمجولی اور ملنے والے روئیں۔ اس لئے نہیں کہ انہیں تمہارے ساتھ جسمانی محبت ہے بلکہ اس لئے کہ یہ ہمارے لئے نیک نمونہ تھا اور اس کی وجہ سے ہمیں نیکیوں کی توفیق ملتی تھی اور اب یہ ہمارے پاس سے جا رہا ہے۔ پس جہاں جاؤ اپنا نیک نمونہ دکھا کر وہاں کی جماعت میں ایسی بیداری پیدا کرو کہ جب تم وہاں سے آنے لگو تو اس شہر یا قصبہ کے لوگ سمجھیں کہ ہمارے اندر سے روحانیت کھنچی چلی جا رہی ہے۔ اگر تم ان چھٹیوں میں یہ نمونہ دکھا کر واپس آؤ تو اللہ تعالیٰ تمہیں توفیق دے گا کہ آئندہ بھی قادیان کی رہائش سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکو۔ بورڈنگ تحریک جدید میں بچوں کو نماز کی باقاعدگی سکھائی جاتی ہے اور نماز ایک ایسی نیکی ہے کہ جو ایک بھی چھوڑے وہ مسلمان نہیں رہ سکتا اور اگر ان بچوں میں سے باہر جا کر کوئی ایک بھی نماز چھوڑے تو گویا وہ تحریک جدید کی ہتک کرنے والا ہو گا۔ جس کا وقار قائم رکھنا تم میں سے ہر ایک کا فرض ہے۔ پس یہاں جو بھی نیک عادات تم کو ڈالی جاتی ہیں ان پر باہر جا کر اچھی طرح قائم رہو۔ جو بورڈر ہیں وہ بھی اور جو نہیں وہ بھی ہر بات میں باہر جا کر نیک نمونہ دکھائیں۔ نمازیں باقاعدگی سے ادا کرو اور ہو سکے تو تہجد بھی پڑھو اور اپنے اردگرد نیک اثرات چھوڑو۔

پھر یاد رکھو کہ اس وقت کی مسلمانوں کی تباہی میں چار باتوں کا بڑا دخل ہے۔

(1) معاملات کی خرابی

(2) سچ نہ بولنا

(3) ہمدردی کا نہ پایا جانا اور ایک دوسرے سے تعاون نہ ہونا۔

(4) قوت عملیہ کی کمزوری۔

یہ چار امور مسلمانوں کی تباہی کا بڑا موجب ہیں اور تحریک جدید کی غرض انہی نقائص کو دور کرنا ہے۔ آج صبح ہی جو مٹی ڈالی گئی ہے وہ بھی اسی لئے ہے کہ

کام کی عادت ڈالی جائے۔ مسلمانوں میں کام کرنے کی عادت بھی نہیں رہی اور ان کے امراء ایسی جھوٹی عزت کے خیال میں پڑ گئے ہیں کہ اٹھ کر پانی پینا بھی دوبھر معلوم ہوتا ہے۔اسی لئے تحریک جدید میں یہ بات مَیں نے رکھی ہے کہ کوشش کی جائے دوستوں میں ہاتھ سے کام کرنے کی عادت پیدا ہو۔

معاملات کی صفائی بھی بہت ضروری ہے اور اس کی آزمائش کا بھی یہ ایک موقع آیا ہے۔ بعض لوگ بغیر کرایہ ادا کئے اور ٹکٹ لئے ریل میں سفر کر لیتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ بات ایمان کے سراسر خلاف ہے۔ مومن کبھی بد معاملہ نہیں ہوتا۔ یہ خیال کرنا کہ انگریزوں کی چوری کرنے میں کوئی حرج نہیں بالکل غلط خیال ہے۔ انگریز چھوڑ کالے چور کا مال کھانا بھی جائز نہیں۔ مومن کو معاملات کا بہت کھرا ہونا چاہئے۔ ہم لوگ اپنے آپ کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰ و السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ آپ کا عملی نمونہ ہمارے سامنے ہے جس سے انسان کو زیادہ محبت ہو اس کی طرف سے زیادہ نصیحت کا وہ محتاج نہیں ہوتا بلکہ اس کے نمونہ کو دیکھتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں جماعت کے بعض دوست داڑھی منڈواتے تھے کسی نے حضور علیہ السلام سے شکایت کی کہ فلاں شخص داڑھی منڈواتا ہے آپ نے فرمایا کہ اگر تو ان میں اخلاص نہیں تو ہماری نصیحت کا ان پر کیا اثر ہو سکتا ہے اور اگر اخلاص ہے تو ہماری داڑھی کو دیکھ کر خود ہی داڑھی رکھ لیں گے۔ تو اصل بات یہی ہے کہ جس سے محبت ہو اُس کا نمونہ ہی کافی ہوتا ہے۔ حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام کے پاس کوئی احمدی آیا کسی نے آپ کو بتایا کہ یہ بغیر ٹکٹ کے آ گئے ہیں۔ یہ ہمارے ملک میں ایک عام رواج ہے۔ بغیر ٹکٹ کے سفر کرنا ایک کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ جیسے چیتے کا شکار کر لیا اسی طرح بغیر ٹکٹ کے سفر کر لیا۔ حضرت مسیحِ موعود علیہ الصلوٰۃ و السلام نے جب یہ بات سنی تو جیب سے ایک روپیہ نکال کر اسے دیا اور فرمایا کہ کسی کا مال استعمال کرنا گناہ ہے۔ آپ اب واپس جائیں تو اس روپیہ سے ٹکٹ خرید لیں۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ و السلام کا یہ طریق ہے جس سے ہمیں

سبق حاصل کرنا چاہئے۔

مجھے ایک احمدی دوست کی بات بہت پیاری معلوم ہوئی۔اگرچہ انہوں نے کی تو غلطی ہی تھی اور مجھ پر بدظنی کی۔جب عزیزم ناصر احمد یورپ سے آخری بار واپس آنے سے پہلے ایک بار چھٹیوں میں یہاں آئے۔تو اتفاقاً یا شاید ارادتاً چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب بھی ملاقات کے خیال سے قادیان آ رہے تھے۔یہاں سے مَیں موٹر پر استقبال کے لئے امرتسر گیا تھا۔وہاں مَیں نے کسی دوست سے کہا کہ ٹکٹ لے آؤ۔چوہدری صاحب نے کہا کہ میرے سیلون میں بیٹھ جائیں۔مَیں نے کہا کہ ہمارے لئے اس میں بیٹھنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔انہوں نے غالباً یہ جواب دیا کہ قانون یہ ہے کہ اگر کوئی ہمارا مہمان ہو تو اس کے لئے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خرید کر اسے سیلون میں بٹھایا جا سکتا ہے۔خیر ہم سیلون میں بیٹھ گئے۔جب میں قادیان پہنچا اور گھر جانے لگا تو امرت سر کے ایک دوست نے کہا کہ مَیں ایک بات کرنا چاہتا ہوں اور الگ ہو کر کہنے لگے کہ مَیں نے یہ دو ٹکٹ خرید لئے تھے (ایک میرے لئے ایک پرائیویٹ سیکرٹری کے لئے) اس خیال سے کہ شاید آپ کو ٹکٹ خریدنے کا خیال نہیں رہا۔آپ سیلون میں بیٹھ گئے تھے اورمیں نے سمجھا کہ اس میں بغیر ٹکٹ کے بیٹھنا آپ کے لئے جائز نہیں اور ٹکٹ خریدنے کا آپ کو خیال نہیں رہا۔ اس لئے مَیں نے یہ دو ٹکٹ خرید لئے تھے۔ان کے خریدے ہوئے ٹکٹ ضائع ہی گئے کیونکہ چوہدری صاحب نے ہمارا کرایہ ادا کر دیا تھا مگر اس دوست کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی کہ انہوں نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ مجھ سے بھولے سے بھی بغیر ٹکٹ کے سفر کرنے کی غلطی ہو۔یہ احمدیت کا سچا نمونہ ہے اور یہی نمونہ ہمارے نوجوانوں کو پیش کرنا چاہئے۔پس اچھی طرح یاد رکھو کہ کبھی بغیر ٹکٹ کے سفر نہ کرو اور کبھی کسی کو بغیر ٹکٹ کے سفر کرتا دیکھ کر خاموش نہ رہو بلکہ اسے نصیحت کرو اور اگر وہ نصیحت پر بھی عمل نہ کرے تو سمجھ لو کہ وہ بیمار ہے اور متعدی بیمار ہے۔ایسے لڑکے کی صحبت سے الگ رہو۔اگر تم اسے دوست کہتے ہو تو گویا اپنی بھی

ہتک کرتے ہو۔اور اس کے معنے یہ ہیں کہ تم اس کے فعل کو پسند کرتے ہو۔

پھر آپس میں ہمدردی کرو اور دوسروں سے بھی ہمدردی کرو۔اگر گاڑی میں کوئی بوڑھا آ جائے تو اس کے لئے قربانی کا نمونہ دکھاؤ۔خود کھڑے ہو جاؤ اور اسے بیٹھنے دو۔ اگر اسے پانی کی ضرورت ہو تو لا دو۔ بیمار ہو تو اسے دبا دو۔ ممکن ہو تو دوائی بھی لا دو۔غرضیکہ ایسا نمونہ دکھاتے جاؤ اور دکھاتے آؤ کہ سب دیکھنے والے کہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھوں میں اگر طاقت آ جائے تو دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔ خوب یاد رکھو کہ دنیا میں امن قربانی سے قائم ہوتا ہے۔زور اورطاقت سے نہیں۔ پس جتنی زیادہ قربانی تم کرو گے۔اتنی ہی جلدی خدا تعالیٰ تمہارے ہاتھوں میں دنیا کی باگ دے گا۔ اور اتنی ہی جلدی تم دنیا میں امن قائم کر سکو گے۔ سستی کی عادت نہ ڈالو اور کبھی یہ نہ سمجھو کہ اب چھٹیاں ہوئی ہیں خوب سوئیں گے۔چھٹیاں سونے کے لئے نہیں ہوتیں بلکہ اس لئے ہوتی ہیں کہ استاد نیا سبق نہ پڑھائے اور طالب علم پچھلا پڑھا ہوا یاد کر لیں۔پس یہ نہ کہو کہ چھٹیوں میں سوئیں گے بلکہ یہ کہو کہ پہلے جو غفلت ہوتی رہی ہے اب چھٹیوں میں اس کا ازالہ کریں گے او رسبق اچھی طرح یاد کر لیں گے۔سکول میں تو مدرّس روز نیا سبق دے دیتا ہے اور اسے یاد کرنا ہوتا ہے۔اس لئے اگر کوئی سبق یاد کرنے سے رہ جائے تو کمزوری رہ جاتی ہے اور چھٹیاں ان کمزوریوں کو دور کرنے کا بہترین موقع ہوتی ہیں۔

سچائی کا بھی اعلیٰ نمونہ دکھاؤ۔جو کہو سچ کہو۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر بات ضرور کہو۔مثلاً کوئی کہے کہ مَیں نے فلاں شخص کو کانا کہا تھاکیونکہ یہ سچی بات ہے اور سچ بولنے کا حکم ہے۔تو یہ درست نہ ہو گا۔ہر سچی بات کا کہنا ضروری نہیں ہوتا۔ حکم یہ ہے کہ جو کہو سچ کہو۔شریعت تمہیں یہ نہیں کہتی کہ ہر سچی بات ضرور کہو۔ شریعت کا حکم یہی ہے کہ جب ضرورت نہ ہو، چپ رہو۔مگر جب بولو تو سچ بولو۔ سینکڑوں باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان ان کو بیان نہیں کر سکتا اور شریعت ان کے بیان پر مجبور نہیں کرتی۔اگر کوئی ایسا عیب کسی میں دیکھو کہ جس کے متعلق شریعت

کہتی ہے کہ اسے بیان نہ کرو تو اسے مت بیان کرو۔ مگر کوئی بات کرو اور جھوٹ بولو یہ جائز نہیں۔ سچ بولنے کے یہ معنے نہیں کہ ہر بات جو تم کو معلوم ہے ضرور بیان کر دو۔ تمہیں یہ حق ہے کہ بعض باتوں کے متعلق کہہ دو کہ مَیں بیان نہیں کرنا چاہتا۔ بعض باتیں خواہ وہ سچ ہوں بیان کرنے سے قانون نے بھی روکا ہے مثلاً قانون یہی ہے کہ جو بات دوسرے کو بُری لگے اس کی بناء پر ہتک عزت کا مقدمہ ہو سکتا ہے۔ پس یہ ضروری نہیں کہ ہر سچی بات ضرور بیان کرو۔ ہاں جو بیان کرو وہ سچ سچ بیان کر دو۔ پس یہ باتیں ضرور اپنے اندر پیدا کرو۔ خدمت خلق، چستی، سچائی اور معاملات کی درستی۔ اگر ایک پیسہ بھی کسی سے لیا ہے تو جب تک اسے واپس نہ کرو تمہیں چین نہ آئے۔ محنت کی عادت ڈالو۔ اپنا سبق اچھی طرح یاد کرو۔ رستہ میں مسافروں سے اچھا سلوک کرو۔ ماں باپ کی خدمت کرو اور ایسا نمونہ دکھاؤ کہ جس طرح پھول لے کر کوئی شخص ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے تو تمام رستہ میں ان کی خوشبو پھیل جاتی ہے اسی طرح اب جو تم اپنے اپنے گھروں کو جو ہندوستان کے ہر گوشہ میں ہیں جاؤ تو تمام ہندوستان تمہاری خوشبو سے مہک اٹھے اور جس طرح پھولوں کی خوشبو پھیلتی ہے تمہاری خوشبو بھی سارے ملک میں پھیل جائے اور تمام ملک تمہاری خوشبو سے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک مہک اٹھے۔ اگر تم ان باتوں پر عمل کرو گے تو واقعی تمام ملک تمہاری خوشبو سے مہک اٹھے گا اور لوگ کہیں گے کہ کیسا خوش قسمت ہے ہمارا ملک کہ جس میں ایسے بچے پیدا ہوئے ہیں۔ اور ملک کی کتنی خوش قسمتی ہے کہ اس کی باگیں اب ان کے ہاتھوں میں آنے والی ہیں۔"

(الفضل 30 جولائی 1941ء)

---

1 تاریخ طبری جلد 5 صفحہ 72 مطبوعہ بیروت 1987ء

2 مسلم کتاب الایمان باب الدلیل علی دخول طوائف المسلمین الجنة بغیر حساب ولا عذاب

3 مسلم کتاب البر و الصلة باب تراحم المومنین و تعاطفهم و

تعاضدھم

4 مجانی الادب جزثانی صفحہ 43 مطبوعہ بیروت